مولانا عبید اللہ سندھی

چند مشاہدات

مولانا سعید احمد اکبرآبادی ایم اے

مرسلہ۔ مولانا عزیز احمد

مولانا عبید اللہ سندھیؒ کا نام بچپن سے سنتا آیا تھا۔ ان کے علم و فضل اور مجاہدانہ کا ذکر لوگ بڑے جوش و خروش سے کرتے تھے اور ان کو سُن سُن کر دل میں جذبہ اور ولولہ اٹھتا تھا اے کاش مولانا اس زندگی میں کہیں مل جائیں اور آنکھیں ان کے دیدار سے شاد کام ہوں۔ آخر نے دل کی یہ مراد پوری کی اور ۱۹۳۹ء میں اچانک سنا کہ مولانا تیئس برس کی جلاوطنی کے بعد ہن تشریف لا رہے ہیں اور جہاز سے کراچی اتر کر سیدھے دلی تشریف لائیں گے۔ اب ایک ایک گھ گننی شروع کر دی اور مولانا کی آمد کا سخت بے چینی سے انتظار ہونے لگا۔ آخر وہ دن بھی ہم سب لوگ مولانا کے استقبال کے لئے دلی اسٹیشن پر پہنچے۔ علماء اور ملک کے زعماء جس ط رہتے تھے اس کے پیش نظر میں نے اس وقت مولانا کی نسبت جو تخیل قائم کیا تھا وہ یہ تھا پر عمامہ ہوگا، جبہ زیب تن ہوگا، فرسٹ کلاس میں سفر کر رہے ہوں گے۔ ایک خادم کم از کم ہمراہ ہوگا۔ دو تین بھاری بھاری سوٹ کیس ایک بھاری بیڈنگ، دو تین تھرماس کی بوتلیں تین ہ بھاری ناشتہ دان ساتھ ہوں گے۔ چہرہ پر تمکنت اور وقار ہوگا۔ لیکن جب ٹرین پہنچی تو یہ تمام اوہام باطلہ ثابت ہو کر رہ گئے۔ لوگ پلیٹ فارم پر ادھر ادھر فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کے درج میں گھومتے پھر رہے ہیں کہ استنے میں دیکھا ایک صاحب ننگے سر، صرف کھدر کا کرتہ اور پاجامہ

اور ایک سفید کھدر کی چادر گلے میں ڈالے ہوئے ایک دم میں تھرڈ کلاس سے پھدک کر پلیٹ فارم پر آ کھڑے ہوئے۔ پہچاننے والوں نے پہچانا اور ان کی طرف لپکنا شروع کر دیا۔ معلوم ہوا کہ یہی مولانا عبید اللہ سندھی ہیں۔ سر اور ڈاڑھی کے بال بالکل سپید تھے۔ عمر ۶۵ اور ۷۰ کے درمیان ہوگی مگر جسم مضبوط اور گٹھا ہوا۔ آنکھوں میں غیر معمولی چمک۔ پیشانی پر مجاہدانہ عزم وہمت کے کس بل، آواز میں طنطنہ اور چہرہ پر بزرگانہ معصومیت کے ساتھ ایک ایسا جلال کہ گویا ایک سپاہی ایک میدان جنگ سے منتقل ہو کر ایک دوسرے میدان جنگ کی طرف آ گیا اور اس نے ایک دوسرا اور نیا مورچہ سنبھال لیا ہے۔ لوگوں کو تلاش ہوئی کہ مولانا کا سامان اتاریں مگر وہاں سامان کہاں تھا جو کچھ مولانا کے جسم پر تھا بس وہی ان کا سامان تھا اور باقی خدا کا نام۔ میں نے دنیا میں علماء بھی دیکھے ہیں اور درویش بھی، تارکین دنیا بھی دیکھے ہیں اور کسانوں اور مزدوروں کے غم میں مرنے والے بھی۔ لیکن دنیا اور اس کی چیزوں سے اس درجہ بے تعلقی بے نیازی اور مکمل قسم کا قلندر آج تک نہ کوئی دیکھا ہے اور نہ شاید دیکھوں گا۔

دلی پہنچنے کے بعد مولانا نے ابتداءً قیام جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مہمان خانہ واقع قرول باغ میں کیا تھا۔ یہ جگہ میرے پڑوس میں تھی، اس لئے مغرب کے بعد اکثر مولانا کی خدمت میں حاضری ہوتی تھی۔ ایک روز میں مولانا کی خدمت میں حسب معمول حاضر ہوا کچھ دیر اِدھر اُدھر کی گفتگو ہوتی رہی۔ جب میں رخصت ہوا تو مولانا بھی ساتھ باتیں کرتے ہوئے کمرہ سے نکل آئے اور سڑک پر کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں دیکھا کہ ایک بڑی موٹر کار ہمارے پاس آ کر رکی۔ موٹر کا دروازہ کھلا تو اس میں سے کراچی کے سیٹھ عبداللہ ہارون باہر نکلے۔ انھوں نے مولانا کو سلام کیا اور کہا کہ مولانا کراچی میں ایک ضروری کام ہے جس کے لئے آپ کو میرے ساتھ کراچی چلنا ہوگا۔ مولانا نے پوچھا 'کب؟' سیٹھ صاحب نے کہا، 'بس ابھی!' سیٹھ صاحب کا یہ کہنا تھا کہ مولانا فوراً لپک کر ان کے ساتھ موٹر میں بیٹھ روانہ ہوگئے۔ نہ کمرہ میں واپس گئے اور نہ وہاں سے کوئی چیز لی اور نہ کمرہ کا دروازہ بند کیا۔ میں ان کے اس انداز پر حیران رہ گیا مگر واقعہ یہ ہے کہ مولانا اگر کمرہ میں واپس جاتے بھی تو لیتے کیا؟ وہاں ان کا سامان تھا ہی کیا؟ وہاں جو بستر پڑا ہوا تھا یا کچھ برتن رکھے ہوئے تھے تو وہ جامعہ کے مہمان خانہ کے تھے مولانا کا کچھ نہ تھا۔

قرول باغ کے مہمان خانہ میں چند قیام فرمانے کے بعد مولانا جامعہ نگر اوکھلا میں منتقل ہوگئے۔ اس زمانہ میں مولانا کا معمول یہ تھا کہ جمعہ کی نماز پابندی کے ساتھ اوکھلے سے آکر دلی کی جامع مسجد میں ادا کرتے تھے۔ جامع مسجد کے مغرب جنوب میں حکیم نابینا مرحوم کا مشہور مطب تھا۔ اور اس مطب سے بالکل متصل ہمارے ایک دوست مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی کا بڑا مکان تھا جس کے ایک وسیع کمرہ میں ادارۂ شرقیہ کے نام سے مولانا موصوف نے ایک تعلیمی ادارہ قائم کر رکھا تھا۔ اس ادارۂ شرقیہ میں جمعہ کی نماز کے بعد سے لے کر عصر تک احباب کا اچھا خاصا اجتماع رہتا تھا۔ مولانا عبید اللہ سندھی بھی جمعہ کی نماز سے فارغ ہو کر سیدھے یہیں تشریف لاتے تھے اور عصر تک رہتے تھے۔ چند روز کے بعد ہم لوگوں کی درخواست پر مولانا نے اس مجلس میں حجۃ اللہ البالغہ کا درس دینا شروع کر دیا۔ درس کی شکل یہ ہوتی تھی کہ کتاب کی کوئی اہم بحث نکال لی اور اس پر تقریر شروع کر دی۔ تقریر کے ختم ہونے کے بعد ہم لوگ سوالات کرتے تھے اور مولانا ان کے جوابات دیتے تھے۔ اس مجلس میں دیوبند کے فضلاء، کی جو دلی میں مقیم تھے وہ اور ان کے علاوہ جامعہ ملیہ کے کچھ اساتذہ اور چند اور ارباب علم شریک ہوتے تھے۔

اس سلسلہ میں ایک مرتبہ کیا ہوا؟ مولانا سندھی حسب معمول اوکھلے سے دلی آئے۔ جامع مسجد میں نمازِ جمعہ ادا کی اور پھر ادارۂ شرقیہ میں تشریف لا کر حسب معمول حجۃ اللہ البالغہ کا درس دیا۔ اس وقت چہرے پر نہ تکان کا کچھ اثر تھا اور آواز میں کسی قسم کا اضمحلال اور ضعف۔ کمال بشاشت اور توانائی سے تقریر کی اور اس کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا تو اس میں بھی پوری توجہ اور حاضر حواسی کے ساتھ حصہ لیا۔ اتنے میں عصر کی نماز کا وقت ہو گیا تو ہم سب کے ساتھ نماز ادا کی۔ اس کے بعد مولانا رخصت ہو گئے۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد کسی ضرورت سے میں چتلی قبر کی طرف گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا ایک بھٹیارہ کی دکان پر بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں کھانا بھی بہت معمولی یعنی دو آنہ کا سالن اور ایک آنہ کی روٹی۔ میں نے کہا حضرت یہ بے وقت کھانا کیسا؟۔ فرمایا اوکھلے میں کھانا تیار نہ تھا اگر انتظار کرتا تو جامع مسجد میں نماز نہیں پڑھ سکتا تھا اس لئے کھانا کھائے بغیر ہی چلا آیا تھا:

یہ تو خیر ہوا ہی، اس سے بھی زیادہ عجیب اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جس واقعہ کا میں نے

اوپر ذکر کیا ہے یہ گرمیوں کے کسی مہینہ میں پیش آیا تھا اور چونکہ مولانا کے پاس اوکھلے اور دلی کی آمد و رفت کا بس کا کرایہ ادا کرنے کے لئے پیسے نہ تھے اس لئے اس روز مولانا سخت تپش اور گرمی کے عالم میں اوکھلے سے دلی آٹھ میل پاپیادہ آئے اور اسی طرح پاپیادہ واپس تشریف لے گئے۔ اس کے متعلق بھی مولانا نے نہ از خود ہم سے کچھ کہا اور نہ چہرہ دیکھ کر کوئی سمجھ سکا بلکہ جامعہ نگر کے ایک صاحب نے جو بس میں سفر کر رہے تھے مولانا کو پیدل آتے ہوئے دیکھ لیا تھا ان سے جب مجھ کو یہ معلوم ہوا تو میں نے مولانا سے دریافت کیا اور مولانا نے اس کی تصدیق کی۔ تو اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ چونکہ اس روز مولانا کو پیدل آنا تھا اس لئے اوکھلے سے ان کو بہت پہلے روانہ ہونا تھا اور اس وقت تک چونکہ کھانا تیار نہیں ہوا تھا اس لئے دلی میں عصر کے بعد کھانا کھایا اور چونکہ جیب میں صرف تین آنہ پیسے تھے جو بس کے کرایہ کے لئے کافی نہیں ہو سکتے تھے اس لئے ان پیسوں سے کھانا کھایا اور اوکھلے سے دلی تک کا سفر پیدل کیا۔

ایک مرتبہ میری موجودگی میں مولانا عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی نے مولانا سے پوچھا کہ " حضرت! آپ نے اپنی زندگی میں کبھی نوکر بھی رکھا ہے ؟ " حسب عادت بپھر کر بولے " مفتی جی ! آپ یہ کیا پوچھتے ہیں۔ کیا کوئی انسان بھی کبھی انسان کا نوکر ہو سکتا ہے۔ ہاں ایک انسان دوسرے انسان کی مدد کرتا ہے۔ میری خدمت بھی میرے دوست احباب کرتے تھے اور میں ان کی خدمت کرتا تھا۔" اسی نشست میں مفتی صاحب نے پوچھا " حضرت : تیس برس کی جلا وطنی کے زمانہ میں آپ پر عیش و مسرت کے بھی کچھ دن آئے ہیں ؟ فرمایا " مفتی صاحب یقین کیجئے اس پوری مدت میں ایک شب بھی ایسی نہیں آئی ہے جس میں میں چین و آرام سے سویا ہوں۔ ہندوستان پہنچنے پر تیس برس کے بعد میں پہلی مرتبہ سکون کی نیند سو سکا ہوں۔

مولانا ہمیشہ ننگے سر رہتے تھے۔ ایک مرتبہ میں اور مولانا دلی کی جامع مسجد کے جنوبی دروازہ کے نیچے کھڑے ہوئے تھے کہ میں پوچھ بیٹھا " مولانا آپ ہمیشہ ننگے سر رہتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے ؟ فوراً لال قلعہ کی طرف اشارہ کرکے کچھ غصہ اور کچھ حسرت کے ملے جلے لہجہ کے ساتھ فرمایا " میری ٹوپی تو اس دن سر سے اتر گئی جس دن کہ یہ لال قلعہ میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ اب جب تک یہ مجھ کو واپس نہیں مل جاتا میری غیرت اجازت نہیں دیتی کہ میں ٹوپی سر پر رکھوں۔"

مولانا کافی عمر رسیدہ تھے۔ عمر کا بڑا حصّہ جلاوطنی کی تکالیف اور مصائب میں بسر کیا تھا، اور بے زر و سرمایہ تھے۔ لیکن حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفہ کی روشنی میں انہوں نے اس پر مسلسل غور و فکر کیا تھا کہ اسلام کو دنیا کے موجودہ اقتصادی، سماجی اور سیاسی حالات میں کس طرح ایک عالمگیر طاقت بنایا جائے جس کا کہ وہ دین فطرت ہونے کے باعث بجا طور پر مستحق ہے اور جو اس کا طبعی حق ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا نے اسلام کے اجتماعی، اقتصادی اور سماجی نظام کا بڑی دقت نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ اور دوسری جانب انہوں نے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں دنیا میں جو عظیم الشان صنعتی انقلاب ہوا اور اس انقلاب کے جو اثرات انسانی فکر و تخیل اور عام معاشرہ پر پڑ رہے ہیں ان سب کا دیدہ وری اور عمیق بصیرت کے ساتھ جائزہ لیا تھا اور اس کے بعد انہوں نے ایک نتیجہ پر پہنچ کر اپنا ایک مستقل فکر قائم کیا تھا۔ مولانا کا یہ فکر بڑا مستحکم اور غیر متزلزل تھا اور اس پر ان کو کامل درجہ کا وثوق اور اعتماد تھا۔ جلاوطنی سے واپسی کے بعد ان کی زندگی کا سب سے بڑا اہم اور مقدس مقصد یہ تھا کہ لوگ ان کے اس فکر کو سمجھیں اور اس کی بنیاد پر سوسائٹی کی از سر نو تشکیل و تعمیر کریں۔ چنانچہ انہوں وطن آنے کے بعد تھوڑے ہی دنوں میں جو مضامین و مقالات لکھے اور جو رسالے تالیف کئے ان کے عمق اور ضخامت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں اپنی فکر کو عام کرنے اور اپنے ہم خیال پیدا کرنے کی کیسی دھن تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ مولانا کو اس میں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی ——— اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ مولانا جتنے بڑے مفکر اور مخلص تھے، اتنے بڑے نہ تو مقرر تھے اور نہ اتنے بڑے انشاء پرداز۔ بات بہت گہری اور پتہ کی کہتے تھے مگر انداز بیان کچھ ایسا گنجلک اور اشتباہ انگیز ہوتا تھا کہ بعض اچھے اچھے اہل علم اور مفکرین بھی ان سے بدظن ہو جاتے تھے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے فکر میں اس درجہ پختہ تھے کہ کسی مسئلہ پر بحث و گفتگو کے وقت ان کا لب و لہجہ درشت اور غیر مصالحانہ ہو جاتا تھا۔ مولانا خود بھی کبھی کبھی اس کا اعتراف کرتے اور اس پر افسوس کرتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کی بڑی تمنا اور آرزو تھی کہ میں کسی طرح ان سے سبقاً سبقاً "حجۃ اللہ البالغہ" پڑھ لوں اور پھر ان کے ارشادات کی روشنی میں "حجۃ اللہ البالغہ" کی شرح" اپنے الفاظ میں لکھ ڈالوں۔ اس اہم کام کے لئے مجھ ایسے ہیچمدان کا مولانا کی نظر میں انتخاب میری سب سے بڑی خوش قسمتی تھی اس بنا پر میرے لئے کیا عذر ہو سکتا تھا۔

میں فوراً اس کے لئے آمادہ ہوگیا۔ اور قرارداد یہ ہوئی کہ مولانا روزانہ مغرب کے بعد اوکھلے سے آئیں گے اور مسجد فتحپوری کے ایک حجرہ میں شب بھر قیام کریں گے۔ ادھر میں عشاء کی نماز سے فارغ ہوکر اپنے مکان قرول باغ سے مسجد فتحپوری آجاؤں گا اور وہاں مولانا مجھ کو دو تین گھنٹے درس دیں گے۔ دوسرے دن میں مولانا کی تقریر درس کو اپنے الفاظ میں قلمبند کرکے ان کو دکھا دوں گا۔ یہ قرارداد ہوچکی تھی اور ابھی اس پر عمل شروع نہیں ہوا تھا کہ مولانا کو پنجاب کا سفر پیش آگیا۔ فرمایا کہ ایک ضروری کام سے جارہا ہوں جلد واپس آجاؤں گا اور آتے ہی یہ پروگرام شروع ہوجائے گا۔ لیکن "آہ" کیسے خبر تھی کہ مولانا کا دلی سے یہ سفر آخری سفر تھا جس سے واپس آنا مقدر نہیں تھا۔ پنجاب اپنی صاحبزادی کے پاس گئے تھے جو خانپور میں تھیں وہاں پہنچنے کے چند روز بعد ہی بیمار ہوئے اور اس قدر شدید کہ جانبری ممکن نہ ہوئی اور واصل بحق ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بہرحال جو ہونا تھا وہ ہوچکا۔ مشیت ایزدی میں کسی کو کیا مجال دم زدن ہے۔ آج مولانا دنیا میں نہیں ہیں لیکن اپنے پیچھے اپنی تحریروں کا جو گراں بہا ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں وہ اس لائق ہے کہ اسلامیات کا ہر طالب علم اس کا غور و فکر سے مطالعہ کرے اس سے فکر کی نئی راہیں سامنے آئیں گی اور تنازع للبقاء کے موجودہ دور میں ایک ایسی روشنی ملے گی جو ہمت اور عزم پیدا کرے گی۔

مولانا عبیداللہ سندھیؒ

مصنفہ پروفیسر محمد سرور

مولانا سندھی مرحوم کے حالاتِ زندگی، تعلیمات اور سیاسی افکار پر یہ کتاب ایک جامع اور تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ایک عرصے سے نایاب تھی۔ یہ کتاب دین، حکمت، تاریخ اور سیاست کا ایک اہم مرقع ہے۔ قیمت مجلد چھ روپے پچھتر پیسے

سندھ ساگر اکاڈمی۔ چوک مینار۔ انارکلی۔ لاہور